بھارت میں ارتداد یا بدحالی کا نتیجہ؟

افتخار گیلانی

بھارت کا دعویٰ ہے کہ وہ ایک سیکولر ملک ہے، جہاں پر مذہب یا اس کا انتخاب کسی شخص کی ذاتی پسند و ناپسند پر منحصر ہے۔ بھارتی آئین کے بنیادی اصولوں کے مطابق حکومت کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ اسی طرح شہریوں کو مذہب کی تبدیلی کی بھی پوری آزادی کا دعویٰ کیا گیا ہے بشرطیکہ اس میں جبر و لالچ شامل نہ ہو۔ اس کے باوجود تبدیلیِ مذہب کو سخت بنانے اور اس کو کئی پیچیدہ شرائط کے ساتھ تابع کرنے کی غرض سے ملک کی آٹھ صوبائی حکومتوں اڑیسہ، مدھیہ پردیش، اروناچل پردیش، چھتیس گڑھ، گجرات، ہماچل پردیش، اترا کھنڈ اور جھارکھنڈ نے ابھی تک اسمبلیوں سے باضابطہ قوانین منظور کروائے ہیں۔ ان کا ہدف خاص طور پر دلت ہیں، جن کے متعلق اونچی ذات کے ہندوؤں کو ہمیشہ خدشہ لاحق رہتا ہے کہ وہ کہیں ان کے ظلم و ستم سے تنگ آکر مسلمان یا عیسائی نہ بن جائیں۔ اگرچہ تبدیلیِ مذہب کو بھی ذاتی فعل کے زمرے میں بیان کیا جاتا ہے، لیکن اگر اس کا جواز یہ بتایا جائے کہ موجودہ مذہب میں رہتے ہوئے حکومت سے انصاف ملنے کی اُمید نہیں ہے، تو یہ کسی بھی معاشرے کے لیے ایک نہایت ہی تشویش کن صورت حال قرار دی جاتی ہے۔

حال ہی میں بھارتی دارالحکومت دہلی سے متصل اتر پردیش صوبہ کے باغپت ضلع کی تحصیل بڑوت کے بدرکھا گاؤں میں ایک ہی مسلم خاندان کے بیس افراد نے مرتد بن کر ہندو مذہب اختیار کرنے کا اعلان کیا۔ ان افراد نے ایک باضابطہ تقریب میں مذہب تبدیل کرنے کے لیے ایس ڈی ایم کے سامنے مذہب تبدیل کرنے کی عرضی دی تھی۔ اپنے نوجوان بیٹے گلشن عرف گلزار کے قتل کے معاملے میں پولیس کے رویے سے تنگ آکر اختر علی کے اہل خانہ جس میں سات مرد اور تیرہ خواتین

شامل تھیں، انھوں نے ایس ڈی ایم بڑوت کو حلفیہ بیان دے کر اپنی مرضی سے اسلام مذہب چھوڑ کر ہندو دھرم اپنانے کی اجازت طلب کی تھی۔ اس کے اگلے دن ہندو رواج کے مطابق ہوان، بھجن و منتروں کے بعد گاؤں کے شیو مندر میں جا کر باقاعدہ اپنا نام اور مذہب تبدیل کرلیا۔ اس دوران ہندو یوا واہنی کے ریاستی صدر شوکیندر کھوکھر اور ضلعی صدر یوگیندر تومر سمیت کئی لوگ بھی موجود تھے۔ ہون اور ہنومان چالیسا کا پاٹھ کیا گیا۔

بتایا جاتا ہے کہ جوگی خاندان کا اختر علی کا بیٹا گلشن علی کپڑے کی تجارت کرتا تھا۔ ماہ جولائی میں گلشن علی کی لاش ان کی ہی دکان میں کھونٹی سے لٹکی ہوئی ملی تھی۔ اہل خانہ کا الزام تھا کہ اس کا قتل کر کے اس کی لاش لٹکا دی گئی تھی، لیکن پولیس کسی تحقیق و تفتیش کے بغیر اس قتل کو خودکشی بتاتی رہی اور خودکشی کا کیس درج کرنے کے بعد جبراً اس کی لاش دفنا دی گئی۔ اس کی شکایت متاثرہ خاندان نے ضلعی اعلیٰ افسران سے کی لیکن کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ معاملے کی تفتیش پر مامور اے ایس پی راجیش کمار شریواستو نے کہا کہ اہل خانہ نے اپنے ہی ہم مذہبوں سے ناراض ہوکر تبدیلی مذہب کیا ہے، مگر اختر علی اور ان کے اہل خانہ نے راقم کو فون پر بتایا کہ ’’مذہب اسلام میں رہ کر وہ اپنے بیٹے کو انصاف نہیں دلا سکتے کیوں کہ پولیس شاید ہی کسی مسلمان کی بات سنتی ہے‘‘۔ ان کو شکوہ تھا کہ ’’گاؤں اور اس کے آس پاس کے مسلمان بھی ان کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں اور نہ پولیس تعاون کر رہی ہے۔ اس لیے ہم لوگوں نے مذہب تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ حکومت دادرسی کرسکے‘‘۔

۲۰۱۷ء میں اترپردیش اسمبلی انتخابات کی رپورٹنگ کرتے ہوئے احساس ہوا کہ ووٹر بجلی، سڑک، پانی سے زیادہ انصاف اور دادرسی کو ترجیح دے رہا ہے۔ دیوبند کے قریب ایک گاؤں میں مجھے بتایا گیا کہ: ’’اگر لکھنؤ میں سماج وادی پارٹی کی حکومت ہے، تو پولیس صرف یادو برادری کی سنتی ہے اور اگر بہوجن سماج پارٹی کی مایاوتی برسراقتدار ہے تو صرف دلت کی شنوائی ہوتی ہے۔ اب بتایا جاتا ہے کہ موجود دور میں جب بی جے پی حکومت ہے، اونچی ذات کے برہمن اور ٹھاکر پولیس تھانوں میں ڈیرے ڈالے ہوئے رہتے ہیں اور صرف انھی کی سفارش پر اب پولیس کوئی کارروائی کرتی ہے‘‘۔

اس طرح کے واقعات شاید بھارت کے طول و عرض میں پیش آتے ہوں گے، مگر جس علاقے میں ارتداد کا یہ سانحہ پیش آیا وہ عالمی شہرت یافتہ دارالعلوم دیوبند سے محض ۱۰۰ کلومیٹر کے

فاصلے پر ہے اور اس علاقے میں مدرسوں، عالیشان مساجد اور سنہرے کلسوں سے مزین خانقاہوں اور درگاہوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ جمعیت علماے ہند کا اچھا خاصا رسوخ ہے۔ جمعیت کے ذمہ داروں کا کہنا ہے کہ: ''ہم نے علاقے کے متعدد ذمہ داروں سے گفتگو کر کے اس مسئلے پر توجہ دینے کی کوشش کی تھی مگر مرتد ہونے والے ان ۱۳/افراد نے برادری، رشتہ داروں کی بھی نہیں مانی۔ ان کا ایک لڑکا پھانسی لگا کر مر گیا تھا۔ اس کا الزام یہ لوگ اسی کے پھوپھی زاد پر لگا کر مسلمانوں کو جھوٹے کیس میں پھانسنا چاہتے تھے، مسلمانوں کے سمجھانے بجھانے کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ لیکن ایک بہو نے مرتد ہونے سے انکار کر دیا اور وہ اپنے بچوں کو لے کر اپنے میکے چلی گئی''۔

جمعیت کے ذمہ داران کچھ بھی صفائی دیں، مگر ان کی ناک کے نیچے اس علاقے کے دیہات میں مسلم آبادیاں کسمپرسی اور جہالت کا شکار ہیں۔ عالیشان مساجد، مدرسوں اور خانقاہوں کو آراستہ بنانے کے ساتھ ساتھ اگر ان آبادیوں کی تعلیم و تربیت اور ان کو روزگار دلانے کی سمت میں بھی وہ کام کرتے تو شاید یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ حالات یہ ہیں کہ اندرون ومضافاتی دیہات میں تو مسلمان دین سے بالکل نا آشنا ہیں، کیوں کہ بڑے حضرات اور داعی اسلام وہاں جانا گوارا ہی نہیں کرتے۔ ان مضافاتی دیہات میں جا کر ان کمزور و بے سہارا اور کھیتی مزدور مسلمانوں کی خیر خبر لینے والے بہت کم ہیں۔ مذہب تبدیل کرنے والوں کا یہ الزام ہے کہ ان کی دادرسی نہیں کی گئی۔ گو یہ تبدیلی مذہب کا معقول عذر نہ ہو، لیکن مسلم تنظیموں کو ملزم کے کٹھرے میں ضرور کھڑا کر دیتا ہے۔ زکوٰۃ کا نظام جو بے سروسامان مسلمانوں کے لیے بنایا گیا تھا وہ زیادہ تر پیشہ ور فنڈ جمع کرنے والوں کے پیٹ کو بھرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ دھیرہ دون سے مفتی رئیس احمد قاسمی کے مطابق ان کے محلے کے ایک کھاتے پیتے مسلم گھرانے کی لڑکی ایک ہندو بھنگی کے ساتھ بھاگ گئی۔ مفتی صاحب نے انتظامیہ پر دباؤ ڈالا تو ڈیڑھ دن بعد پولیس نے لڑکی کو برآمد کر لیا مگر لڑکی جیسے ہی جج کے سامنے پہنچی، اس نے اس بھنگی کے ساتھ جانے اور اپنے ہندو ہونے کا اعلان کر دیا۔ مفتی صاحب کے بقول ان کے علم میں پانچ ایسی مسلم لڑکیاں ہیں جو صرف بھنگی برادری میں گئیں ہیں۔ عام ہندوؤں کے ساتھ جانے والی لڑکیوں کی اکیلے دھیرہ دون میں ہی ایک بڑی تعداد ہے۔

مسلم پرسنل لا بورڈ کے سیکرٹری مولانا محمد عمر محفوظ رحمانی کے مطابق چند برسوں سے

باضابطہ پلاننگ کے تحت مسلمان لڑکیوں کو جال میں پھنسا کر ہندو بنایا جا رہا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ گذشتہ سال جب وہ مسلم پرسنل لا بورڈ کے ایک پروگرام میں مہاراشٹر کے مشہور شہر پونا گئے تو معلوم ہوا کہ ان کے ایک جاننے والے کی بھانجی نے ہندو لڑکے کے ساتھ بھاگ کر کورٹ میرج کی ہے۔ معلوم ہوا کہ صرف پونا میں دو برسوں میں ۴۴ مسلمان لڑکیوں نے غیرمسلم لڑکوں کے ساتھ شادی کی ہے۔ اسی سال اگست میں ۱۱ مسلمان لڑکیوں کی غیرمسلم لڑکوں کے ساتھ شادی کی درخواستیں کورٹ میں دائر ہوئی ہیں اور ستمبر میں ۱۲ لڑکیوں نے درخواست دی ہے۔ اسی طرح بمبئی میں ۱۲، تھانے میں ۷، ناسک میں ۲، اور امراوتی میں ۲ لڑکیوں نے کورٹ میں دیگر مذاہب کے لڑکوں کے ساتھ شادی کی درخواست دی ہے۔

بھوپال کی گنجان مسلم آبادی والے ایک علاقے میں اس طرح کے دسیوں واقعات ہو چکے ہیں، اور صرف غیرشادی شدہ لڑکیاں ہی نہیں شادی شدہ عورتیں بھی اپنے شوہر اور بچوں کو چھوڑ کر غیرمسلموں کے ساتھ چلی گئی ہیں۔ کچی بستیوں میں رہنے والی مسلمان لڑکیاں فرقہ پرست عناصر کی اس منصوبہ بند سازش کا 'لقمۂ تر' بنی ہوئی ہیں۔ مولانا صاحب کے مطابق گجرات میں مسلمان لڑکیوں کو رجھانے، قریب کرنے اور پھر ان کا جنسی استحصال کرنے کے لیے گراں قیمت تحفے دیے جاتے ہیں، مثلاً مہنگے موبائل، آئی پیڈ، لیپ ٹاپ، ایکٹیوا بائک وغیرہ۔ ان کی باضابطہ 'فنڈنگ' کی جارہی ہے اور ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت انھیں اس کام پر لگایا گیا ہے۔ یہ محض اتفاقی واقعات نہیں ہیں بلکہ ان کے پیچھے ایک سوچا سمجھا منصوبہ کام کر رہا ہے۔ 'لوّ جہاد' نام کی کوئی چیز اس ملک میں نہیں ہے، البتہ یہ 'شوشہ' صرف اس لیے چھوڑا گیا تھا کہ ہندو نوجوانوں میں 'انتقامی جذبہ' اُبھارا جائے اور خود مسلمانوں کو 'لوّ جہاد' میں الجھا کر اندرون خانہ مسلمان لڑکیوں کو تباہ و برباد کرنے کا کھیل کھیلا جائے۔ ان کے مطابق باضابطہ ایسے ہندو جوانوں کی ایک ٹیم تیار کی گئی ہے، جن کا کام ہی محبت کے نام پر مسلمان لڑکیوں کو تباہ و برباد کرنا ہے۔ یہ لوگ پہلے ہمدردی کے نام پر کسی مسلمان لڑکی سے قریب ہوتے ہیں، پھر محبت کا فریب دیتے ہیں، اور شادی کا وعدہ کرتے ہیں، اور پھر جنسی استحصال کا مرحلہ شروع ہو جاتا ہے اور جب وہ لڑکی عفت و عصمت کا گوہر لٹا چکتی ہے اور اس لڑکے سے شادی کا اصرار کرتی ہے تو پھر کورٹ میں کورٹ میرج کی درخواست دی جاتی ہے۔

پچھلے ماہ اسی طرح کے ایک واقعے میں ہریانہ کے روہتک ضلع کے ٹٹولی گاؤں میں ایک پنچایت نے فرمان جاری کر کے مقامی مسلمانوں پر ٹوپی پہننے اور لمبی داڑھی رکھنے پر پابندی عائد کی۔ اس کے علاوہ یہ بھی حکم دیا گیا کہ: ''وہ بچوں کے ہندو نام ہی رکھیں گے''۔ گاؤں کے بیچ میں وقف بورڈ کی جو زمین قبرستان کے لیے استعمال ہوتی تھی اس کو پنچایت نے اپنی تحویل میں لے کر زرعی اراضی میں تبدیل کر دیا۔ بتایا جاتا ہے کہ عید الاضحیٰ کے موقعے پر گاؤں میں دھوبی خاندان کے یامین کھوکھر پر الزام لگایا گیا کہ اس نے بچھڑے کی قربانی کی تھی۔ بعد میں اس کو پولیس گرفتار کر کے بھی لے گئی، مگر جلد ہی ضمانت پر وہ رہا ہو گیا۔ روہتک نمبردار نے ۲۰ ستمبر کو اجلاس بلا کر الیاس کو گاؤں بدر کرنے کا حکم سنایا۔ گاؤں کی ۳ ہزار نفوس کی آبادی میں ۶۰۰ مسلمان ہیں۔ اس فرمان میں مزید یہ حکم دیا گیا کہ: ''گاؤں میں کہیں بھی کھلی جگہ پر نماز ادا نہیں کی جائے گی''۔ یاد رہے گاؤں یا اس کے آس پاس میں کہیں بھی مسجد نہیں ہے۔ مسلم آبادی جمعہ کی نماز ادا کرنے کے لیے روہتک شہر جاتی ہے۔

اسی سال مارچ میں آگرہ کی کچی بستی مدھونگر میں تین سو مفلوک الحال مسلمانوں کے مرتد ہونے کی خبر آئی۔ انتہاپسند ہندو تنظیموں نے ان کی 'گھر واپسی' یعنی ہندومت اختیار کرنے کی تقریب منعقد کی، جس میں ۷۰ کے قریب افراد نے شرکت کی تھی۔ بھجنوں کے درمیان ہندو دھرم اختیار کیا۔ اسی مہینے فیض آباد، یوپی سے بھی ۲۲ مسلمانوں کے مرتد ہونے کی خبر آئی تھی۔ میڈیا سے بات چیت میں ان لوگوں نے کہا: ''ہم سے وعدہ کیا گیا ہے کہ راشن کارڈ اور مفت ہاؤسنگ پلاٹ دیے جائیں گے''، جو کہ سراسر لالچ اور غربت کا ناجائز فائدہ اُٹھانا ہے۔

چوں کہ تقسیمِ ملک کے وقت یہ علاقہ شدید فسادات کی زد میں آ گیا تھا، جو لوگ کئی وجوہ کی بنا پر ہجرت نہیں کر سکے تھے، انھوں نے اپنی حفاظت کی خاطر اپنے نام تبدیل کر دیے۔ وہ دیوالی، ہولی اور دیگر ہندو تہوار بھی مناتے ہیں، مگر گھروں میں اسلامی رسوم و رواج کو انھوں نے زندہ رکھا ہوا تھا۔ ان کی نئی پود اب باقاعدہ مسلم شناخت کے ساتھ زندہ رہنا چاہتی ہے، جس پر اعتراض کیا جا رہا ہے۔ بہار میں دربھنگہ کے ایک گاؤں میں ایک مسلم خاندان پر پنچایت نے ۲۵ ہزار روپے کا جرمانہ عائد کیا، کیوں کہ اس نے بڑے جانور کا پایہ اپنے گھر میں پکایا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ۲۰۰۲ء میں

گجرات میں ہونے والے مسلم کش فسادات کے بعد جن لوگوں نے دیہی علاقوں سے ہجرت کر کے کیمپوں میں پناہ لی تھی، جب ان کی واپسی کی کوششیں ہو رہی تھیں، تو کئی علاقوں کی پنچایتیں ان کو اسی شرط پر واپس بسانے پر تیار تھیں کہ مسلمان حلفیہ بیان میں یہ یقین دلائیں کہ نہ وہ گاؤں میں مسجد بنائیں گے اور نہ بلند آواز میں اذان دیں گے۔ یہ باضابطہ تحریری حلفیہ بیانات تھے۔ اسی طرح کی چند اور شرائط بھی تھیں۔

اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام کی رپورٹ کے مطابق بھارت میں ہر تیسرا مسلمان غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزار رہا ہے۔ پچھلے ۵۰ برسوں میں ان کی حالت دلتوں اور قبہر زدہ قبائل سے بھی بدتر ہو چکی ہے۔ یہ وہی قوم ہے جو ایک صدی قبل تک اس خطے کی حکمران تھی۔ مذبح خانے (سلاٹر ہاؤس) بند کیے جانے سے اتر پردیش میں ہزاروں مسلمان بے روزگار ہو چکے ہیں۔ گائے کے نام پر افواہ پھیلا کر جانوروں کا کاروبار کرنے والوں کو جس طرح مارا پیٹا جا رہا ہے، اس سے چھوٹے چھوٹے مسلمان تاجروں کو کاری ضرب پہنچی ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ بڑے تاجر جو بکرے اور بڑے گوشت کو خلیجی اور دیگر ممالک کو برآمد کرتے ہیں، ان کے کاروبار شد و مد کے ساتھ جاری ہیں، کیوں کہ ان میں اکثریت جین یا ہندو ہیں۔

شاید یہ واقعات اسلام کے نام پر وجود میں آئے پاکستان میں رہنے والے مذہبی ادارے چلانے والوں اور ارباب حل و عقد کی سمجھ میں نہ آئیں، کیوں کہ وہ فرقہ بندی اور فروعی معاملات میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ انھیں کیا معلوم کہ آزادی کی فضا میں ان کے سانس لینے کی کیا قیمت بھارتی مسلمان ادا کر رہے ہیں۔ بجاے اس کے کہ وہ اپنے اخلاق سے دنیا کو اسلام کی صحیح تعریف سے روشناس کرواتے، ایک دوسرے پر کیچڑ اُچھالنے کے رجحان نے تو اچھے خاصے مسلمان کو بھی خوار اور مایوس کیا ہے۔ اُمید تھی کہ جو کام ۸۰۰ سال تک برصغیر پاک و ہند پر حکومت کرنے والے مسلم حکمران نہیں کر پائے، قائداعظم محمد علی جناح کے جانشین اس ملک کو ایک لیبارٹری کی طرز پر استعمال کر کے اسلام کے حقیقی سماجی انصاف کے پیغام کو عام کر کے برصغیر کے دیگر خطوں، خاص طور پر بھارت میں رہنے والے مسلمانوں کے لیے مشعل راہ اور مثال کا کام کریں گے۔ ان کی اس کاوش سے بھارت میں دیگر مذاہب، خصوصاً دلتوں تک اسلام کے آفاقی نظام کو پہنچانے میں مدد ملتی۔

ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر بھارت کے پسماندہ طبقات کے سب سے بڑے لیڈر تھے۔ ان کا رجحان اسلام قبول کرنے کا تھا۔ اسلام کی طرف مگر ان کے بڑھتے قدم رک گئے جس کی ایک بڑی وجہ ان کا یہ احساس تھا کہ مسلمانوں کے اندر چھوٹی بڑی ذاتوں کا سسٹم موجود ہے۔ اگر انھوں نے اسلام قبول کرلیا تو انھیں مسلم سماج میں بھی برہمنواد کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اسی طرح مسلمانوں کے اندر مسلکی جھگڑا بھی انھیں دکھائی دیا، جو ان کے لیے پاؤں کی زنجیر بن گیا۔ انھوں نے ایک موقعے پر اپنی تقریر میں کہا: ''میں اسلام قبول کرنا چاہتا ہوں، لیکن اگر میں اسلام قبول کرتا ہوں تو مجھے وہابی کہہ کر خارج از اسلام کر دیا جائے گا''۔ قصۂ مختصر، اگر مسلمان اپنا وتیرا تبدیل نہیں کرتے، اسلام کے حقیقی سماجی انصاف کے پیغام کو عملاً نہیں اپناتے، تو دلتوں اور دیگر طبقات کو اپنے ساتھ ملانا تو دُور کی بات، خود مسلمانوں کی نئی پود بھی دور چلی جائے گی۔